محمد یوسف چوہان[1]

ڈاکٹر نذیر احمد: تحقیقِ منسوبات کا اہم ستون

Abstract: In Pseudepigraphic Research issues of attributions of texts, books or places etc. to fake authors are examined and attributed to the original authors. Dr. Najmul Islam was the first, who coined the term Tehqeeq-e-Mansoobat for Pseudepigraphic Research in Urdu language. In Tehqeeq-e-Mansoobat in Urdu, Allama Shibli Noumani is the founder of this branch of research. Dr. Nazeer Ahmad is an important figure in Tehqeeq-e-Mansoobat. On his credit, there are research works on Tehqeeq-e-Mansoobat about Meena Bazaar, Misbahul Arwah and other books of Jamali Dehlvi and Jamali Urdistani, Dewan-e-Hafiz and Dewan-e-Umeed, Chandar Badan-o-Mahyar, Moonis-ul-Ahrar, Dewan-e-Khwaja Qutab-ud-Din Bukhtiyar Kaaki, Firhang-e-Qawwas, Kulyat-e-Muhammad Quli Qutab Shah Etc.

Key Words: Research on Attributions, Dr. Nazir Ahmed, Meena Bazaar, Diwan-e-Hafiz, Diwan-e-Khawaja, Qutubuddin Bakhtiar Kaki, Kulyat-e- Muhammad Quli Qutub Shah.

کلیدی الفاظ: تحقیقِ منسوبات، ڈاکٹر نذیر احمد، مینا بازار، دیوانِ حافظ، دیوانِ خواجہ، قطب الدین بختیار کاکی، کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ۔

منسوبات کا تعلق، انتساب کے متعلقات سے ہے، جن میں سرقہ، الحاق، التباس، انتحال، جعل اور ملکیتِ تصنیف سے متعلق امور شامل ہیں۔ ان متون کو منسوبات کے ذیل میں رکھا جاتا ہے، جو اپنی اصل کے علاوہ کسی اور طرف منسوب ہوں۔ تحقیقِ منسوبات سے مراد انتساب کے مسائل کی تحقیق کر کے صداقت تک رسائی ہے۔ منسوبات کی اصطلاح میں وہ غلط انتسابات بھی شامل ہیں، جو اماکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو میں اس اصطلاح کو وضع کرنے اور اس کی حدود کو متعیّن کرنے کا کارنامہ ڈاکٹر نجم الاسلام (م: ۲۰۰۱ء) کے سر جاتا ہے۔ تحقیقِ

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج منڈی بہاء الدّین

منسوبات کا بانی ہونے کا شرف علامہ شبلی نعمانیؒ(م: ۱۹۱۴ء) کو حاصل ہے۔ ان کے بعد تحقیقِ منسوبات پر جن محقّقین کا کام نمایاں ہے، ان میں حافظ محمود شیرانی (م: ۱۹۴۶ء) کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد (م:۲۰۰۸ء) کا نام نہایت ادب و احترام سے لیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد یوپی میں پیدا ہوئے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کی زیرِ نگرانی ظہوری ترشیزی پر انگریزی میں تحقیقی مقالہ لکھا، جس پر ۱۹۴۵ء میں ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ اس کے بعد عادل شاہی دور کے فارسی شعرا پر تحقیقی کام کے نتیجے میں ۱۹۵۰ء میں انھیں لکھنؤیونیورسٹی نے فارسی میں ڈی لٹ کی ڈگری دی۔ ابراہیم عادل شاہ کی کتاب ''نورس'' پر تحقیقی کام پیش کرنے پر ۱۹۵۶ء میں ان کو اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری دی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں ان کا تقرر لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کے لیکچرار کی حیثیت سے ہوا۔ اگست ۱۹۵۸ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ فارسی میں ریڈر مقرر کیے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں شعبۂ فارسی کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں آرٹس فیکلٹی کے ڈین ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں یونیورسٹی کی ملازمت سے سبک دوش ہوگئے۔ اسی سال صدرِ جمہوریۂ ہند کی طرف سے فارسی خدمات کے صلے میں ان کو تاحیات ایک معقول رقم کا انعام اور توصیفی سند دی گئی۔ ۱۹۷۸ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے انعام کے حقدار قرار دیے گئے۔ ۱۹۸۷ء میں حکومتِ ہند کی طرف سے پدم شری کے خطاب سے نوازے گئے۔ اسی سال خسرو اکیڈمی امریکہ نے خسرو انعام ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے حافظ کے دو قدیم ترین مخطوطات دریافت کیے اور ان کو مرتب کر کے شائع کروایا۔ ان کے اس کام کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے خانۂ فرہنگِ ایران (دہلی) نے "حافظ شناس" کا خطاب دے کر ان کی فارسی شناسی کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔[۱] ان کے علمی آثار میں تحقیق و تدوین کا نہایت وقیع کام شامل ہے۔

تحقیقِ منسوبات کے سلسلے میں ڈاکٹر نذیر احمد کی خدمات نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں جب ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کی پہلی جلد ظہوری ہز لائف اینڈ ورکس (انگریزی) الٰہ آباد سے شائع ہوئی تو ڈاکٹر محمد احمد صدیقی کو اس کے مطالعے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے مقالے میں ظہوری (م: ۱۰۲۵ھ) کو مینا بازار کا مصنف تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس پر ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے ایک اختلافی مضمون "مینا بازار کا مصنف" کے عنوان سے لکھ کر مئی ۱۹۵۴ء کے معارف اعظم گڑھ میں شائع کروایا، جس میں دلائل کے ساتھ مؤقف اختیار کیا گیا کہ ''مینا بازار'' کا مصنف ظہوری اور صرف ظہوری ہے۔[۲] ڈاکٹر نذیر احمد نے جوابی مضمون "مینا بازار کا مصنف" کے

عنوان سے جولائی ۱۹۵۴ء کے معارف اعظم گڑھ میں شائع کروایا، جس میں انھوں نے مؤقف اختیار کیا کہ ڈاکٹر محمد احمد صدیقی نے بغیر کسی تلاش و تحقیق کے یہ مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ زیرِ بحث مضمون میں ڈاکٹر نذیر احمد ہی کا فراہم کیا ہوا مواد ہے، ان کے ہی پیش کیے ہوئے دلائل سے دوسرا نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔[۳] اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹر محمد احمد صدیقی کے مضمون کا تجزیہ کر کے دلائل سے ان کے مؤقف کو رد کیا۔ اس مضمون کا دوسرا حصہ اگلے ماہ کے شمارے میں شائع ہوا، جس میں مزید داخلی اور خارجی دلائل سے معترض کی رائے کو رد کیا گیا۔ آخر میں تحقیق کے سات اصول بیان کیے گئے۔[۴]

اسی سال ڈاکٹر محمد احمد صدیقی کی مرتبہ "مینا بازار" مطبع اسرارِ کریمی الہ آباد سے شائع ہو گئی۔ مقدمے میں ڈاکٹر صدیقی نے پھر اپنے موقف کو دہرایا کہ یہ اختلاف اگر صرف قدیم مصنفین ہی کے یہاں ہوتا تو زیادہ حیرت کی بات نہ تھی۔ آج کا ایک مصنف ڈاکٹر نذیر احمد بھی اسے ظہوری کے بجائے کسی اور کی تصنیف بتاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس خصوص میں ایک مختتم اور مستوعب بحث کر کے یقینی طور پر صحیح مصنف کا نام بتا دیا جائے۔ ڈاکٹر صدیقی طولانی بحث کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ بحثیں کافی ثبوت اس امر کا ہیں کہ مینا بازار ظہوری کی تصنیف ہے۔[۵] اس مقدمے کا جوابی مضمون ڈاکٹر نذیر احمد نے "مقدمہ مینا بازار نوشتہ ڈاکٹر محمد احمد صدیقی پر ایک نظر" کے عنوان سے ستمبر ۱۹۵۴ء کے معارف اعظم گڑھ میں شائع کروایا۔ انھوں نے مقدمے میں اکیس تاریخی، تنقیدی اور تحقیقی اسقام کی نشان دہی کرنے کے بعد لکھا کہ جن قیاسات سے ڈاکٹر محمد احمد صدیقی مینا بازار کو ظہوری کی تصنیف بتاتے ہیں، وہ ہرگز قابلِ یقین نہیں۔[۶]

اب ڈاکٹر نذیر احمد نے مینا بازار کو باقاعدہ موضوع بنا کر لکھنا شروع کر دیا۔ ان کا مضمون "مینا بازار" اپریل ۱۹۵۵ء کے معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے لکھا کہ "مینا بازار" کے مصنف نے کتاب کا نام تجویز نہیں کیا، بعد کے لوگوں نے اُسے اس نام سے مشہور کر دیا۔ پہلی بار یہ لفظ بہارِ عجم میں ملا، جو ۱۱۶۲ھ کی تالیف ہے۔ اکبر نے اس بازار کو آئین میں داخل کر کے اسے بڑی اہمیت دی، اس لیے کتاب "مینا بازار" کو عموماً عہدِ اکبری سے متعلق سمجھا گیا، حالانکہ کوئی ایک بھی ایسا قرینہ نہیں، جس سے یہ تصنیف اس کے عہد کی قرار دی جا سکے۔ کتاب پر سنہِ تصنیف درج نہیں، مضمون نگار نے "مینا بازار کا سنہِ تصنیف" کی سرخی کے تحت اس معاملے پر بحث کی اور نتیجہ نکالا کہ عہدِ اکبری کے بعد کسی زمانے میں اس کتاب کی تکمیل ہوئی ہو گی، خواہ وہ زمانہ جہانگیر، شاہجہاں

اورنگ زیب یا کسی اور بادشاہ کی حکومت کا ہو مگر اس سے قبل کا ناممکن ہے۔ کتاب میں تمباکو فروش کا ذکر ہے۔ شمالی ہند کے بازاروں میں تمباکو کا رواج ۱۶۰۴ء کے بعد ہوا یعنی یہ کتاب اس سنہ کے بعد لکھی گئی ہو گی۔ (۷) مضمون نگار نے ''مینا بازار کا مصنف'' کی سرخی لگا کر تاریخی ترتیب سے اس مسئلے پر بحث کی کہ کچھ لوگ اس کتاب کا مصنف ارادت خاں واضح کو قرار دیتے ہیں اور کچھ ظہوری کو۔ مضمون کی دوسری قسط معارف اعظم گڑھ کے جولائی ۱۹۵۵ء والے شمارے میں شائع ہوئی، جس میں ''محاکمہ'' کی سرخی کے تحت ڈاکٹر نذیر احمد نے نو قرائن واقعاتی اور خارجی شہادت کے پیش کیے، جن کی بنا پر اس کتاب کو ظہوری کی تصنیف ماننے میں سخت تامل ہے۔ ایک دلیل یہ دی کہ ظہوری کی تصنیفات میں حمد و نعت کا باقاعدہ التزام ہوتا ہے، اس کے برعکس ''مینا بازار'' کا مولف حمد و نعت کے بغیر بازار کی آرائش کی خوش خرمی سے اپنی کتاب شروع کر دیتا ہے۔ (۸) مضمون کا باقی حصہ اگست ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر نذیر احمد داخلی شواہد کے انبار لگانے کے بعد لکھا کہ: ''اس کتاب کے کم از کم چار مطبعوں یعنی محمدی، مصطفائی، خدائی اور نول کشور کے مطبوعہ نسخے ارادت خاں واضح کی طرف منسوب ہیں۔ اسی طرح بیشتر مخطوطات بھی واضح ہی کے نام سے ملتے ہیں۔ اس کتاب کو ظہوری کی طرف منسوب کرنے والوں میں خانِ آرزو، ٹیک چند بہار، علی ابراہیم خاں خلیل، عبدالرزاق سورتی، غیاث الدین، صہبائی اور محمد بادشاہ شامل ہیں۔ ان کے برخلاف اس کتاب کو ظہوری کی تصنیف نہ ماننے والوں میں قدیم تذکرہ نویسوں کے علاوہ چند محقق بھی شامل ہیں، جنھوں نے معقول وجوہ کے ساتھ اپنا خیال ظاہر کیا ہے، خصوصاً مرزا قتیل اور غالب۔ اگرچہ ان کے اقوال بھی غلطی سے پاک نہیں، لیکن انھوں نے معقول دلائل پیش کیے ہیں، اس لیے ان کا قول زیادہ وقیع ہے۔ ''مینا بازار'' میں رعایتِ لفظی و تکرارِ لفظی کی کثرت، ہندی الفاظ و فقرات و محاورات کی افراط، تمباکو کی ساری تفصیلات وغیرہ اس کے تاخرِ زمانی کا پتا دیتے ہیں۔ (۹)

ڈاکٹر نجم الاسلام نے رائے دی کہ ڈاکٹر نذیر احمد کے ''مینا بازار'' پر فاضلانہ مضامین سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ ظہوری کی تصنیف نہیں لیکن ارادت خاں واضح کا تعلق ہنوز تشنۂ تحقیق ہے۔ ''مینا بازار'' اور پنج رقعہ وغیرہ اس کے نام سے چھپتے رہتے ہیں، جب کہ ایک دیوانِ فارسی اور نثر فارسی میں تاریخ بہادر شاہی بالیقین اس کی تصانیف ہیں، جن کی مدد سے ایک مثبت نتیجے کی تلاش میں اسلوبیاتی تجزیے اور تقابل کا عمل اسی طرح ارادت خاں

واضح سے تعلق کے باب میں دہرایا جاسکتا ہے، جیسا کہ فاضل مقالہ نگار نے مینابازار سے ظہوری کے تعلق کی تحقیق میں اختیار کیا ہے اور بخوبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مینابازار ظہوری کی تصنیف نہیں۔[۱۰]

اصولِ تحقیقِ منسوبات کے موضوع پر ڈاکٹر نذیر احمد کا صرف ایک مضمون "تحقیق و تصحیح متن کے مسائل" ہے، جو مارچ ۱۹۶۳ء میں نقوش لاہور میں شائع ہوا۔ یہ شہکار مضمون پانچ حصّوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصّہ (ب) "قدیم متنوں میں تصرّفات و تحریفات کے وجوہ" پر ہے، جس میں انھوں نے متن میں تصرّفات کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک الحاق کی شکل میں، اور دوسرے متن کی زبان میں تغیّر، ترمیم و اصلاح کی صورت میں۔ اوّل الذّکر حالت میں دوسروں کا کلام شامل ہو جاتا ہے اور آخر الذّکر صورت میں مصنف کی زبان میں طرح طرح کی ترمیمیں دانستہ اور نادانستہ طور پر عمل میں آتی ہیں۔ محقق دونوں طرح کے تصرّفات کا تعین کرتا ہے اور متن کو کاٹ چھانٹ کر اصل متن متعین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ متن میں تصرّفات مختلف اسباب کی بنا پر عمل میں آتے ہیں، جن کا احاطہ مشکل ہے۔[۱۱] اس کے بعد انھوں نے چودہ وجوہ کی نشان دہی کی ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک مضمون ”خسروِ ثانی شیخ جمالی دہلوی“ کے عنوان سے جولائی تا ستمبر ۱۹۵۴ء میں سہ ماہی ”اردو ادب“ علی گڑھ میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے 'تصانیف' کے عنوان کے تحت جمالی دہلوی (م:۹۴۲ھ) کی چار تصانیف: مہر و ماہ، دیوان، مراۃ المعانی اور سیر العارفین پر روشنی ڈالنے کے بعد دنیا کے مختلف کتب خانوں میں ۲۶ کتب مع مصباح الارواح کی ایسی فہرست دی، جو جمالی سے منسوب ہیں اور جن کے بارے میں افناؤ نے رائل ایشیاٹک بنگال کی فہرست میں قیاس ظاہر کیا کہ جمالی دہلوی مؤلفِ سیر العارفین مذکورہ ۲۶ کتب کا مصنف نہیں بلکہ ان کا مصنف 'ایرانی جمالی' ہے۔ افناؤ نے دونوں شعرا کی تواریخِ وفات میں اختلافات کو نمایاں کرنے کے بعد تین داخلی شہادتیں پیش کیں، جن سے ان کے موقف کو تقویت ملتی ہے۔ اسپرنگر، زاخو اور ایتھے اگرچہ افناؤ کے برعکس دونوں شعرا کو ایک ہی قرار دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر نذیر احمد نے افناؤ کی تحقیق میں تواریخِ وفات میں اختلاف اور داخلی شواہد میں معمولی اسقام کے باوجود ان کے نتیجے سے اتفاق کیا۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ 'افناؤ کے شبہات قابلِ توجہ ہیں' اور مزید چار شواہد دے کر قیاس ظاہر کیا کہ جمالی دہلوی، جمالی ایرانی سے الگ ہے، اس لیے اوّل الذّکر کی مصنّفات وہی چار ہیں، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔'[۱۲]

پنجاب یونی ورسٹی کے اورینٹل کالج لاہور کے جشنِ صد سالہ تاسیس کے موقع پر تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ضیاء الدین سجادی نے مصباح الارواح پر ایک مقالہ پیش کیا، جس میں انھوں نے اس کتاب کا مصنف جمالی دہلوی (م:۹۴۲ھ)، صاحبِ سیر العارفین بتایا اور دعویٰ کیا کہ یہ کتاب بعض مآخذ میں جمالی اردستانی (م:۸۷۹ھ) کی طرف منسوب ہے، جو غلط ہے۔ پروفیسر سجادی نے اس کے علاوہ کہا کہ فتح الابواب، شرح الواصلین اور مزید تیرہ کتب بھی جمالی دہلوی کی ہیں۔ اس مقالے کا جوابی مضمون "کیا مصباح الارواح کا مصنّف جمالی دہلوی تھا؟"، ڈاکٹر نذیر احمد نے اپریل ۱۹۸۱ء کے ماہنامہ معارف علی گڑھ میں شائع کروایا۔ انھوں نے متذکرہ بالا تیرہ کتب کے بارے میں رائے دی کہ پروفیسر سجادی سے بڑا سہو ہوا ہے کہ انھوں نے مندرجۂ بالا ساری کتابوں کو جمالی دہلوی کی تصانیف قرار دے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتابیں جمالی اردستانی کی ہیں۔ مرآت المعانی اور سیر العارفین البتہ جمالی دہلوی کی تصانیف ہیں۔ متعدّد خطی نسخوں اور مطبوعہ کتب کے حوالوں کے ساتھ داخلی و خارجی شواہد کی بنیاد پر مضمون نگار نے پروفیسر سجادی کے مؤقف کو غلط ثابت کیا۔۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے موقف کی تائید میں دوسرے محقّقین کی آرا بھی پیش کیں۔ ۱۹۷۴ء میں جمالی دہلوی کی مثنوی مہر وماہ بہ تصحیح و تحشیہ و مقدمہ حسام الدین راشدی شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے جمالی کی طرف منسوب چند مثنویوں کے بارے لکھا کہ ان کا انتساب جمالی دہلوی کی طرف غلط ہے اور اپنے مؤقف کے حق میں دلائل دیے۔ [۱۳] فروری تا جون ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر ظفر الہدیٰ مرحوم کا مضمون "جمالی، لودی اور مغل دور کا شاعر" مترجمہ سلطان احمد، معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا۔ اس کے تیسرے حصے میں "مثنویاتِ جمالی" کے نام سے پانچ مثنویوں: مصباح الارواح، شرح الواصلین، محبوب الصدیقین، مہر القلوب اور کشف الارواح کا کسی قدر تفصیلی اور پانچ مختصر مثنویوں: فرصت نامہ، نصرت نامہ، قدرت نامہ، فضیلتہ العقل اور نور علیٰ نور کا بہت اجمالی تذکرہ شامل ہے۔ مضمون کی چوتھی قسط یعنی مئی کے شمارے میں نتیجہ نکالا گیا کہ مندرجہ بالا مثنویاں جمالی دہلوی کے نام منسوب کی جاتی ہیں لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہ اس جمالی کی نہیں بلکہ کسی دوسرے شاعر کی ہیں۔ [۱۴] مضمون سے پتا چلتا ہے کہ مضمون نگار جمالی اردستانی سے واقف نہیں لیکن جمالی نام کی دو شخصیّتوں کا قائل ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی رائے میں جمالی کی منظومات کا جو مجموعہ پروفیسر سجادی کے مطالعے میں تھا، اس کا مخطوطہ پیرس کا ہے۔ اس کا عکس تہران یونی ورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے اور اس کا مختصر ذکر فضل اللہ جمالی

اردستانی دہلوی کے نام سے ایرج افشار نے فہرست مائیکرو فیلم ہاے کتاب خانہ، دانش گاہِ تہران میں کیا ہے۔ دراصل یہاں جمالی دہلوی اور جمالی اردستانی دونوں کو ملا دیا گیا ہے البتہ سعید نفیسی کے ایک نسخے کے ذیل میں شرح الکنوز اور میزان الحقائق کو جمالی اردستانی کی تصنیف قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں کہ پروفیسر سجادی کے پیشِ نظر صرف پیرس کے مخطوطے کا عکس تھا، بقیہ مواد اس کی دسترس میں نہ تھا۔ تہران میں اس سلسلے میں جو کام ہوا ہے، وہ اس سے بھی ناواقف ٹھہرے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نذیر احمد کا مضمون پہلے نکل چکا تھا، اس لیے انھوں نے اس موضوع پر اظہارِ خیال ضروری سمجھا۔ [۱۵]

راقم کی نظر سے پروفیسر سجادی کی کتاب مقدمہ ای بر مبانی عرفان و تصوّف گزری، جس میں موصوف نے بحوالہ دربارۂ آثارِ جمالی، دیوان عماد فقیہ کرمانی، مقدمہ، ص۲۸، جمالی اردستانی کے بارے میں لکھا: "۔۔۔و از آثار معروف او، مصباح الارواح، فتح الابواب، شرح الکنوز، کنزالدقائق، تنبیہ العارفین، کشف الارواح و میزان الحقائق است۔۔۔"[۱۶] گویا ڈاکٹر سجادی نے بعد ازاں ڈاکٹر نذیر احمد سے رجوع کر لیا۔

میرزا محمد قزوینی(م:۱۹۴۹) نے ۱۳۲۳ شمسی میں ڈاکٹر قاسم غنی کی شراکت میں دیوانِ حافظ کا ایک ناقدانہ ایڈیشن کتاب فروش زوار کی طرف سے شائع کیا، جس کی بنیاد نسخۂ خلخالی پر تھی۔ عبدالرحیم خلخالی کا دستیاب شدہ یہ نسخہ حافظ (م:۷۹۲ھ) کی وفات کے ۳۵۔۳۶ سال بعد لکھا گیا تھا۔ قزوینی نے مقدمے میں خلخالی کے نسخے کے علاوہ سارے اور اشعار جو دوسرے نسخوں میں زیادہ تھے، الحاقی قرار دے دیے۔ اس پر ڈاکٹر نذیر احمد کا مضمون ''دیوانِ حافظ میں الحاق'' جنوری ۱۹۵۷ء کے معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے دیوانِ حافظ میں شامل الحاقی کلام کی نشان دہی کی۔ ان کے خیال میں، صفوی عہد میں جب مذہبی تعصب و تنگ نظری کا غلبہ ہوا تو شاہ اسمٰعیل صفوی نے خواجہ حافظ کی قبر کی تخریب کا ارادہ کیا، اس وقت حافظ کے بعض بہی خواہوں نے حافظ کے دیوان میں ایسی نظموں کا اضافہ کر دیا، جس سے حافظ کا تشیع پوری طرح ثابت ہو جائے۔[۱۷] ''دیوانِ حافظ میں الحاق'' کی اگلی قسط معارف اعظم گڑھ کے اگلے شمارے میں شائع ہوئی، جس میں ڈاکٹر نذیر احمد نے "حافظ کے مذہب" پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے الحاقی کلام کی نشاندہی کی۔ انھوں نے لکھا کہ جن اشعار سے حضرت علیؓ و خاندانِ اہلِ بیت سے بے پناہ عقیدت ظاہر ہوتی ہے اور بعض میں خلفائے راشدین پر طعن بھی ملتا ہے، ان میں سے بیشتر الحاقی ہیں اور صرف دو رباعیاں اور دو غزلیں ایسی ضرور ہیں، جن میں حضرت علیؓ سے خصوصی ارادت ظاہر ہوتی ہے، مگر

اس سے ان کا تشیع ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح کی عقیدت خاندانِ اہل بیت اور حضرت علیؓ سے ہر سُنی رکھتا ہے، اگر کوئی اس کے خلاف ہو تو وہ سُنی قرار ہی نہیں پا سکتا۔[۱۸] اس مضمون کی تیسری قسط معارف اعظم گڑھ کے اگلے شمارے میں شائع ہوئی، جس میں "حافظ و شاہانِ ہند" کی سرخی کے تحت حافظ کے ہندوستان میں ورود پر الحاقی روایات کو تحقیق کر کے الگ کیا گیا۔ حافظ کی ایک غزل میں غیاث الدین بن شاہ اسکندر پادشاہِ بنگال کا تذکرہ ہے، جس کی وجہ سے طرح طرح کی روایات کا چرچا ملتا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے تحقیق کر کے سب کی جانچ پڑتال کی اور ان میں الحاقات کی نشان دہی کی۔ قزوینی استر آبادی مؤلف بحیرہ کی روایت میں اسقام دکھائے۔ ڈاکٹر قاسم غنی کی رائے کہ یہ غزل سلطان غیاث الدین محمد سے متعلق ہے، کو دلیل سے رد کیا۔ "حافظ اور محمود بہمنی" کی سرخی کے تحت باقی روایات سے اختلاف کرتے ہوئے، تاریخِ فرشتہ کی روایت کو اہمیت دی گئی۔[۱۹]

ڈاکٹر نذیر احمد کا اس سلسلے میں ایک اور مضمون "دیوانِ حافظ کا ایک قدیم مخطوطہ" دسمبر ۱۹۶۰ء کے مجلۂ علومِ اسلامیہ، ادارۂ علومِ اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے لکھا کہ کتاب خانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن میں ایک اہم قدیم نسخہ موجود ہے، جس کی کتابت سنہ ۸۱۸ ہجری میں ہوئی۔ گویا یہ اعتبارِ قدامت اب تک کے دریافت شدہ نسخوں میں یہ دوسرا یا تیسرا ہے۔ سب سے قدیم آیا صوفیہ اور برٹش میوزیم کے نسخے ہیں، جو ۸۱۳ھ اور ۸۱۴ھ کے درمیان لکھے گئے، پھر آصفیہ کا ۸۱۸ھ کا لکھا ہوا نسخہ، پھر قونیہ کا نسخہ، جس کی کتابت ۸۱۹ھ میں ہوئی، اس کے بعد نسخۂ خلخالی، مکتوبہ ۸۲۸ھ۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جس طرح آصفیہ کے نسخے کے علاوہ جو مطالب ہیں، ان کے الحاقی قرار دیے جانے کا فیصلہ غلط ہے، بالکل اسی طرح نسخۂ خلخالی کے علاوہ جو غزلیں، قطعے، قصیدے اور رباعیاں ہیں اور جن کے الحاقی ہونے کا فیصلہ قزوینی کر چکے ہیں، وہ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ گویا یہ حافظ کے دیوان کے حصے تھے، جو نسخۂ خلخالی میں شامل نہیں ہو سکے۔ مختصر یہ کہ یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ نسخۂ خلخالی کے علاوہ جو مطالب ہیں، ان میں کچھ حصہ ایسا ہے، جو یقیناً قابلِ اعتماد ہے اور جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔[۲۰]

ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک مضمون "مقدّمۂ جامع دیوانِ حافظ کے بارے میں ایک مختصر گزارش" مئی ۱۹۹۸ء کے تحقیق، شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے لکھا کہ جدید نسخوں میں جو علامہ قزوینی کا مقدمہ ہے، وہ قابلِ اعتبار نہیں، اس میں الحاق ہے۔ اس میں حافظ کی تاریخِ وفات ۷۹۱ھ مع ایک قطعۂ شعر درج

ہے، یہ تاریخ غلط ہے۔ حافظ ۷۹۲ھ میں فوت ہوئے۔ جن نسخوں پر ان کے انتقادی متن کی بنیاد ہے، اُن کی تفصیل علامہ نے درج کر دی ہے۔ علامہ قزوینی کو مقدمۂ جامعِ دیوان کا نہ کوئی قدیم نسخہ اور نہ کوئی تاریخ دار نسخہ ملا اور بعض وجوہ سے برٹش میوزیم کا ۹۳۱ھ کا نسخہ بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ اس لیے جو متن انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان میں شامل کیا، وہ رطب و یابس سے پاک نہیں۔[۲۱] اسی شمارے میں حافظ کے کلام میں الحاق سے متعلق ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک اور مضمون "حافظ شیرازی کے دیوان میں غلط انتسابات کی مثالیں" شائع ہوا، جس کے مطابق علامہ قزوینی نے ایک نظریہ قائم کیا کہ یہ قدیم نسخہ الحاق سے پاک ہے اور اس میں جو کلام ہے وہی حافظ کا ہے، نہ کم نہ بیش اور جو کچھ زائد کلام بعد کے نسخوں میں ہے، خواہ وہ قلمی ہوں یا مطبوعہ، وہ سب الحاقی ہے۔ حسنِ اتفاق سے حافظ کے دیوان کے دو قدیم نسخوں تک ڈاکٹر نذیر احمد کی رسائی ہوگئی، ان میں سے ایک آصفیہ لائبریری کا نسخہ تھا، جو باوجود اس کے کہ اس کی تاریخ کتابت ۸۱۸ھ کی ہے، وہ خلاصۂ دیوانِ حافظ ہے۔ دوسرا نسخہ گورکھپور، ۸۲۴ھ کا مکتوبہ ہے۔ علامہ قزوینی کے قرار دادہ الحاقی منظومات میں سے نسخۂ آصفیہ اور نسخۂ گورکھپور کے زائد منظومات خود علامہ کے اصول کی بنا پر حافظ کا اصیل کلام ہیں۔ خلاصہ یہ کہ حافظ کے دیوان میں الحاقی کلام کا تعین تقریباً ناممکن ہے اور اب تک اس سلسلے کی ساری کوششوں کا نتیجہ بے سود ہے۔ حال ہی میں فارسی رباعیات کا ایک ضخیم مجموعہ نزہت المجالس نام کا دریافت ہوا ہے، اس کا مرتب جمال خلیل شروانی ہے۔ اس مجموعے پر رقم رباعیات کا مطالعہ معاصر شاعروں کی رباعیات کی اصالت کے تعین میں نہایت ضروری ہے، اس کے مقیاس پر حافظ کی رباعیات کی اصالت پرکھی جا سکتی ہے۔[۲۲] اس کے بعد مضمون نگار نے اس اصول کی وضاحت میں چند مثالیں پیش کیں۔

محمد اکبر الدین صدیقی کا مضمون "مرزا محمد مقیم مقیمی سلمی مصنف چندر بدن و مہیار" کے عنوان سے اکتوبر ۱۹۵۷ء کے نوائے ادب بمبئی میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے لکھا کہ میرزا محمد مقیم استر آبادی نہیں، مشہدی تھا۔ مرزا محمد مقیم نے فارسی میں اپنا تخلص مقیم اور سلمی استعمال کیا تو دکھنی میں مقیمی۔ یہی چندر بدن و مہیار کا مصنف ہے اور اسی نے اس قصہ کو سب سے پہلے ادبی شکل دی۔[۲۳] اس سلسلے میں ڈاکٹر نذیر احمد کا جوابی مضمون ''چندر بدن و مہیار کے مصنف کے تعین کے بارے میں محمد اکبر الدین صدیقی صاحب کی کوشش کا جائزہ''، دسمبر ۱۹۵۷ء کے اردو ادب علی گڑھ میں شائع ہوا۔ انھوں نے لکھا کہ ڈاکٹر صدیقی نے، میری چیزوں کا تو کیا ذکر، ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی وغیرہ کی کتابوں کا بھی بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ورنہ بعض مسلمات کا انکار ایسی جلدی نہ

کرتے۔ کون نہیں جانتا کہ میرزا محمد مقیم استر آبادی کا ذکر خود اس کے معاصر اور ہم وطن فزونی استر آبادی نے فتوحات میں کیا۔ ایسی حالت میں یہ دعویٰ کہ فزونی استر آبادی کوئی شخص ہی نہیں، محمد عادل شاہ کے دور کا شاعر مشہدی تھا، حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر کوئی دلیل نہیں دی۔ انھوں نے مرزا محمد مقیم رضوی مشہدی اور مرزا محمد مقیم استر آبادی کو ہی ایک نہیں سمجھا، بلکہ مرزا مقیم سلمی کو بھی ان کے ساتھ ملا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ حدیقۃ السلاطین کے بیان کیے ہوئے قطب شاہی دور کے ملا مقیم کو بھی ان ہی کے ساتھ شامل کر دیا۔ نذیر احمد نے دلائل کی بنیاد پر رائے دی کہ مرزا مقیم استر آبادی اور مقیمی صاحبِ چندر بدن و مہیار دو الگ الگ شخصیات ہیں۔ مرزا مقیم استر آبادی اور میرزا مقیم سلمی دونوں محمد عادل شاہ کے دربار میں بیجاپور میں تھے، احمد نگر اور گول کنڈہ سے ان کا تعلق نہیں۔ ملا مقیم عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا امیر ہے، جو بیجاپور میں بغرضِ سفارت آیا تھا، احمد نگر اور بیجاپور سے اس کا اقامتی تعلق نہیں۔ چوں کہ صدیقی صاحب کو مرزا مقیم کے قیامِ بیجاپور سے اپنے دعوے کی تصدیق کرنی ہے، اس لیے اس پر زور دیتے ہیں۔[۲۴]

"مونس الاحرار مؤلفہ احمد بن محمد کلاتی اصفہانی" کے عنوان سے ڈاکٹر نذیر احمد کا مضمون اکتوبر ۱۹۶۱ء کے فکر و نظر، علی گڑھ میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے فارسی اشعار کی ایک قدیم بیاض مونس الاحرار میں شعرا کے کلام کے انتسابات کو حل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کلاتی، جاجرمی اور حلاوی کا موازنہ کرتے ہوئے قطعی طور پر کہا کہ جس طرح کلاتی اور جاجرمی کے متعلق یہ طے ہے کہ ایک نے دوسرے سے محض استفادہ نہیں بلکہ سرقہ کیا ہے، اسی طرح کلاتی اور حلاوی کا معاملہ ہے، خواہ حلاوی نے کلاتی سے کیا ہو یا اس کے برعکس صورت ہو مگر اس استفادے میں سرقہ کا الزام نہیں عائد ہو سکتا کیونکہ حلاوی کا دیباچہ مختلف ہے۔ عزالدین نام کے دو شعرا کے انتساب پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دونوں عزالدین ایک ہی ہیں لیکن دونوں کے ایک ہونے کے امکانات ہیں۔ دوسری بات یہ کہ فہرست میں اس کا نام سید عزالدین قزوینی لکھا ہے اور اسی نام کے ایک شاعر کا کلام حلاوی نے بھی انتخاب کیا ہے۔ حلاوی کا کلاتی سے استفادہ کرنا مسلم ہے، اس لیے امکان ہے کہ ایک ہی شاعر تینوں کے یہاں ہو۔ عمید تولکی کے قصائد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان سے بعض کی نسبت عمید کی طرف مشکوک اور بعض کی غلط ہے۔[۲۵] اس مضمون میں ڈاکٹر نذیر احمد نے عمید کی نسبت تولکی لکھی۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں ان کا مضمون "تیرھویں صدی کا ایک اہم شاعر عمید تولکی سنامی"، فکر و نظر علی گڑھ میں

شائع ہوا، جس میں عمید کے انتساب کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کا نام عمید الدین اور لقب فخر الملک تھا لیکن ایک نامعلوم شخص کے مطابق، عمید اور فخر الملک دو الگ شاعر تھے ۔ اسی طرح آقائے دانش پژوہ نے دانشکدۂ ادبیاتِ تہران کی ایک بیاض میں مندرج اس شاعر کے اشعار فخر الملک اور عمید الملک دو الگ عنوان کے تحت بیان کیے اور انھیں دو الگ شاعر تجویز کیا مگر یہ غلط ہے ۔ عمید الدین اور فخر الملک سے ایک ہی شاعر مراد ہے۔ عمید کی وطنی نسبت کے بارے میں اپنے ہی انتساب کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھا کہ منتخب التواریخ کی ایک جگہ کی شہادت اور گل رعنا کے واضح بیان کے بعد یہ نسبت تولکی ہے، بقیہ سب نسبتیں غلط ہیں۔ دیلم اور تولک کو الگ الگ جگہ سمجھنے پر اصرار مطلق درخورِ اعتنا نہیں قرار پاسکتا۔ ۲۶ مئی ۱۹۹۸ء کے تحقیق جام شورو میں ڈاکٹر نذیر احمد کا مضمون ''عمید لویکی کے کلام میں غلط انتسابات کی نشان دہی'' شائع ہوا، جس میں ایک بار پھر اپنے ہی گزشتہ مضمون میں عمید کے حوالے سے غلط انتساب کی اصلاح کی گئی کہ عمید کے دیوان کے دریافت ہونے کے بعد یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ تذکروں اور تاریخوں میں مندرج ساری نسبتیں غلط ہیں، صحیح نسبت لویکی ہے، جو خاندانی نسبت ہے۔ نصیر الدین محمد کے نام کے دو اہم قصیدے دیوان عمید میں موجود ہیں اور یہ دونوں تاریخِ بدایونی سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان دونوں کو نصیر الدین کے بجائے غیاث الدین بلبن کے بیٹے کے نام سمجھا گیا ہے، جو غلط ہے۔ ایک قصیدہ تذکرۂ خلاصۃ الاشعار میں دوبار اور مونس الاحرار کلاتی میں ایک بار عمید کے نام سے نقل ہے لیکن یہ انتساب غلط ہے، اس کا ناظم مشہور فارسی شاعر امیر معزّی (م: ۵۴۲ھ) ہے۔ اسی طرح ایک اور قصیدہ عمید کے نام سے ان کتابوں میں درج ہے، جو کمالی بخارائی کا ہے۔ مجلۂ ارمغان میں عمید کے نام ایک قصیدہ درج ہے، لیکن یہ قصیدہ عمید کا نہیں بلکہ معزّی کا ہے اور دیوانِ معزّی میں شامل ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے چار قصیدوں کو الحاقی قرار دیا ہے۔ ابوالحسن فراہانی شارح مشکلاتِ انوری نے ان میں سے دو کو صراحتاً عمید کا بتایا اور چونکہ یہ قصاید تسلسل کے ساتھ عمید کے ذیل میں نقل ہیں، اس لیے انھیں بحالتِ موجودہ عمید ہی کا سمجھنا چاہیے۔ عمید لویکی کے دیوان میں ایک حکیمانہ قصیدہ ہے، جس کو نظام گنجوی کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو غلط ہے۔ یہ قصیدہ عمید لویکی کا ہی ہے۔ (۲۷)

دیوانِ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، لکھنؤ سے پہلی بار فروری ۱۸۷۹ء میں مطبع نامی منشی نول کشور سے شائع ہوا۔ یہ دیوان خواجہ بختیار کاکیؒ سے منسوب ہے۔ اس کے آخری صفحے پر لکھا ہے کہ بڑی تلاش کے بعد دیوانِ

متبرک کا ایک نسخہ دستیاب ہوا، تو منشی نول کشور نے بڑی توجہ سے ایک خوش نویس کاتب کو کتابت کے لیے دیا، نسخے میں پہلی غزل کا شعر اس صورت میں تھا:

اے لال در ثنائے صفاتت زبانِ ما　　　اے در صفاتِ وحدتِ تو لال عقلِ ما

کاتب بڑا سمجھدار تھا، اس کو دوسرے مصرعے کا قافیہ کھٹکا تو اس نے اس کو نہ لکھا اور جگہ چھوڑ دی۔ پھر وہ جناب استاذ الشعرا آفتاب الدولہ بہادر قلق کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا ان کو سُنایا۔ وہ انھیں ساتھ لے کر اپنے پیرو مرشد جناب مولانا عبد الرّزاق صاحب کی خدمت میں پہنچے اور دیوان کے اس مشتبہ مقام کو دکھایا۔ مولانا نے فرمایا، توقف کیجیے اور خود حجرے میں تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد نکلے اور دوسرا مصرع اس طرح فرمایا:

ے　وے در صفاتِ وحدتِ تو عقلِ نارسا

اور پھر دوسرا مصرع اسی طرح نقل ہوا۔[۲۸] دیوان مذکور ایک دوست کی وساطت سے ڈاکٹر نذیر احمد کی نظر سے گزرا۔ اس پر جون ۱۹۹۰ء میں ان کا مضمون معارف اعظم گڑھ میں "کیا دیوانِ قطب الدین، دیوانِ خواجہ بختیار کاکیؒ ہے؟" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کے خیال میں دیوانِ قطب الدین کا خواجہ بختیار کاکی (م: ۶۳۴ھ) سے کوئی تعلق نہیں۔ دراصل نام کی یکسانی سے دھوکا ہوا، اوّل الذّکر گیارھویں بلکہ بارھویں صدی کا شاعر معلوم ہوتا ہے، خواجہ بختیار کی طرف اس دیوان کا انتساب غلط ہے اور یہ نتیجہ قطعی اور ہر شبہ سے پاک ہے۔ قطب الدین نے حافظ کی قدم قدم پر پیروی کی ہے۔ حافظ کی وفات ۷۹۲ھ میں اور خواجہ بختیار کی ۶۳۴ھ میں، حافظ سے تقریباً ۱۵۸ سال پہلے۔ قطب الدین کی زبان جدید تر ہے، جس کو فارسی زبان شناسی کا ذرا سا ملکہ ہوگا، وہ بتادے گا کہ قطب الدین کا کلام اوائل ساتویں صدی ہجری کا ہو ہی نہیں سکتا۔ دیوان قطب الدین، مطبع نول کشور والوں کو ملا تو انھوں نے اس کو ایک بڑی ہم نام شخصیت یعنی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی طرف منسوب کر کے چھاپ دیا۔[۲۹]

ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک مضمون "فارسی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات (ایک جائزہ)"، سہ ماہی اردو کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے لکھا کہ محمود شیرانی نے ادبی دنیا میں اوہام و مفروضات کے پچاسوں بت توڑے۔ فردوسی کی طرف یوسف زلیخا کا انتساب، فردوسی کی ہجوِ محمود، فارسی دیوان کا حضرت شیخ معین الدین چشتی کی طرف انتساب، پرتھی راج راسا منسوب بہ چندبردائی، امیر خسرو کی طرف منسوب خالق باری وغیرہ موضوعات پر انھوں نے جس دقیق نظری سے بحث کی ہے اور جعلی انتساب کا پردہ

چاک کیا، وہ تحقیقی دنیا کے شاہ کار ہیں۔[۳۰] اس کے بعد انھوں نے شیرانی کے منہجِ تحقیق منسوبات کے حوالے سے بطورِ مثال ان موضوعات پر باری باری اہم نکات پیش کیے۔ مزید بر آں انھوں نے دیوانِ مجعولِ رودکی، دیوانِ اسدی، دیوانِ انوری میں الحاق، عطار نیشاپوری کی طرف منسوب کتابیں، دیوانِ معین الدین چشتی، شرحِ مخزن الاسرار میں شیرانی کے منہجِ تحقیق پر بطورِ خاص روشنی ڈالی۔

''فرہنگِ قوّاس مؤلفہ فخر الدین مبارک شاہ غزنوی کا ایک جعلی نسخہ بھوپال میں'' کے عنوان سے ڈاکٹر نذیر احمد کا مضمون، غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، جولائی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ فرہنگِ قوّاس کا مؤلف فخر الدین مبارک شاہ غزنوی ہے، جس نے علاء الدین خلجی کے عہد (۶۹۵۔۷۱۵ھ) میں یہ فرہنگ مرتب کی۔ اس فرہنگ کا محض ایک ناقص نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس نسخے کا ایک انتقادی متن مع توضیحی حواشی اور تفصیلی مقدمے کے بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب تہران سے شائع کیا۔ ڈاکٹر شہریار نقوی کی فارسی کتاب فرہنگ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، مطبوعہ وزارتِ فرہنگ تہران، ۱۳۴۱ میں بھوپال کے حمیدیہ کتاب خانے کے فرہنگِ قوّاس کے ایک نسخے کا حوالہ درج ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے نقوی صاحب کی کتاب پر تہران کے ایک مجلّے میں تبصرہ شائع کیا، جس میں خصوصیت سے نقوی صاحب کے اس بیان کی تردید کی۔ نذیر احمد کے اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ ڈاکٹر شہریار کی توضیح سے ثابت تھا کہ یہ فرہنگ عربی فارسی الفاظ پر مشتمل تھی، حالانکہ فرہنگِ قوّاس کا جو نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے، وہ خالص فارسی الفاظ کو حاوی ہے۔ نذیر احمد کو فروری ۱۹۸۳ء کے آخری ہفتے میں بھوپال جانے کا اتفاق ہوا تو حمیدیہ کتاب خانے میں اس نسخے کے مطالعے کا موقع ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ تو عربی کا ایک ضخیم لغت ہے یعنی اس میں جو الفاظ درج ہیں، وہ سب عربی کے ہیں، فارسی کے الفاظ سے یکسر صرفِ نظر ہوا ہے، البتہ توضیح فارسی زبان میں ہے۔ اس نسخے اور کلکتہ والے نسخے میں کوئی مناسبت نہیں۔ دونوں دو فرہنگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس مضمون میں ایک تو ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے ہی سابقہ مضمون میں غلط انتساب کی درستی کی اور دوسرے کثیر دلائل سے ثابت کیا کہ نسخۂ کلکتہ ہی اصل نسخہ ہے جبکہ بھوپال کے نسخے کا عنوان فرہنگِ قوّاس غلط ہے۔ نسخۂ بھوپال جس کتاب کی نمائندگی کرتا ہے، وہ دسویں صدی ہجری سے قبل کی ہرگز نہیں ہے۔[۳۱]

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۶۵ء)، ۱۹۴۰ء میں مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس، حیدر آباد دکن سے شائع ہوا، جس کے "مقدمہ" میں انھوں نے لکھا کہ موجود معلومات کی بناپر اتنا یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ۔ ۱۰۲۰ھ) ۱۴ سال کی عمر میں بھاگ متی پر عاشق ہوا اور اس کی خاطر اس نے ندی میں اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ جب اس کی خبر اس کے باپ ابراہیم قطب شاہ کو ہوئی تو اس نے ندی پر پل بنوا دیا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی ابراہیم کا انتقال ہو گیا اور محمد قلی نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی محبوبہ کی خاطر ہزار سوار اس کے یہاں متعین کر دیے۔ اسی اثنا میں اس نے اپنی محبوبہ کے گاؤں کو شہر بنا دیا اور اس کے نام پر اس کا نام بھاگ نگر رکھا۔ بعد ازاں محمد قلی نے بھاگ متی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا اور حیدر محل کا خطاب دیا۔ پھر اس خطاب کی مناسبت سے بھاگ نگر کا نام بھی حیدر آباد میں تبدیل کر دیا گیا۔[۳۲] اس پس منظر میں پروفیسر ہارون خاں شروانی نے انیس صفحات کا ایک کتابچہ "بھاگ متی کا افسانہ" کے نام سے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ پروفیسر شروانی نے اپنے موقف کی تائید میں دلائل دیے اور لکھا کہ تمام کہانی فرشتہ کے ذہنِ رسا کا ایک کرشمہ ہے۔ جب مغل آئے تو انھوں نے قطب الملک کے نام کو نیچا دکھانے کے لیے اس کے ماتحت پر ایک اور کلنک کا ٹیکا لگانے کی کوشش کی۔ اس کوشش کو غلام حسین خان کے ہاتھوں زک پہنچی مگر یہ زک نہایت کمزور ثابت ہوئی اور فاحشہ، بھاگ متی کے رومان میں جو لطف تھا، اسے انیسویں صدی اور اس کے بعد کے موٴرخوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جیسے کسی ناول کے کردار کو اصلیت کی کسوٹی پر رکھنا چاہیں تو کچھ باقی نہیں رہتا، اسی طرح اگر ہم بھاگ متی کے افسانے کو تاریخ کی کسوٹی پر رکھیں تو پورا قصہ بے اصل ہو کر رہ جاتا ہے۔[۳۳] اس کتابچے کے جواب میں، ڈاکٹر نذیر احمد نے مضمون "حیدر آباد کا پرانا نام: بھاگ نگر ___ افسانہ یا حقیقت" لکھا، جو ۱۹۸۸ء میں "خدا بخش لائبریری جرنل" پٹنہ میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے شروانی کے تمام اعتراضات کے ایک ایک کر کے اطمینان بخش جوابات دیے اور محمد قاسم فرشتہ کو بھی یہ کہہ کر بری کر دیا کہ اس کی تاریخ ۱۰۱۷ھ میں لکھی گئی تھی اور اس سے ۱۶ سال قبل فیضی بھاگ متی اور بھاگ نگر کا ذکر کر چکا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ فیضی کا بیان ایک سفیر کا سرکاری بیان ہے، جو ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک ہے۔ اسی طرح نظام الدین بخشی کی طبقات اکبری، جس میں بھاگ متی اور بھاگ نگر کا واقعہ مذکور ہے، فرشتہ سے ۱۵ سال قبل کی تالیف ہے۔ آخر میں ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنی گفت گو کا خلاصہ یوں پیش کیا کہ ۱۰۰۲ھ تک نئے شہر کا نام بھاگ نگر ہی تھا۔ فرشتہ، عبد الباقی نہاوندی موٴلف مآثر رحیمی اور خافی خان موٴلف منتخب

اللباب وغیرہ مؤرخین کے بیان سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ بعد میں بھاگ نگر حیدر آباد کہلایا۔ اگر مآثر رحیمی کی یہ روایت تسلیم کرلی جائے کہ حیدرآباد نام تجویز ہونے میں مرزا محمد امین میر جملۂ شہرستانی کو دخل تھاتو ۱۰۱۰ھ سے قبل یہ نام وجود میں نہ آیا ہو گا۔ اس لیے کہ میر جملہ اسی سال دربارِ قطب شاہی میں باریاب ہوا اور ایک سال بعد میر جملہ مقرر ہوا۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ میر جملگی کے بعد یعنی ۱۰۱۱ھ اور ۱۰۱۲ھ کے درمیان بھاگ نگر کا نام حیدر آباد تجویز ہوا۔ بھاگ متی اور بھاگ نگر کے سلسلے میں شروانی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ در خورِ توجہ نہیں۔[۲۴]

حوالہ جات:

۱۔ ماریہ بلقیس، پروفیسر (مرتبہ): پروفیسر نذیر احمد در نظرِ دانش مندان (علی گڑھ، شعبۂ فارسی، علی گڑھ یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء) ص۵۵۔

۲۔ احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد: "مینا بازار کا مصنف"، مطبوعہ معارف (اعظم گڑھ، جلد ۷۳، نمبر ۵، مئی ۱۹۵۴ء) ص۳۵۹۔

۳۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "مینا بازار کا مصنف"، مطبوعہ معارف (اعظم گڑھ، جلد ۷۴، عدد ۱، جولائی ۱۹۵۴ء) ص۶۔

۴۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "مینا بازار کا مصنف"، مطبوعہ معارف (اعظم گڑھ، جلد ۷۴، عدد ۲، اگست ۱۹۵۴ء) ص۹۶۔۹۷۔

۵۔ احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد (مرتب): مینا بازار، (الہٰ آباد، مطبع اسرارِ کریمی، ۱۹۵۴ء) ص۱۴۔

۶۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: مقدمہ مینا بازار نوشتہ ڈاکٹر محمد احمد صدیقی پر ایک نظر، مطبوعہ معارف (اعظم گڑھ، جلد ۷۴، نمبر ۳، ستمبر ۱۹۵۴ء) ص۲۲۱۔

۷۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "مینا بازار"، مطبوعہ معارف (اعظم گڑھ، جلد ۷۵، عدد ۴، اپریل ۱۹۵۵ء) ص۲۷۱۔

۸۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "مینا بازار"، مطبوعہ معارف (اعظم گڑھ، جلد ۷۶، عدد ۱، جولائی ۱۹۵۵ء) ص۲۰۔

۹۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "مینا بازار"، مشمولہ معارف (اعظم گڑھ، جلد ۷۶، عدد ۲، اگست ۱۹۵۵ء) ص۱۰۷۔

۱۰۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "کیا مینا بازار ظہوری کی تصنیف ہے؟"، مطبوعہ تحقیق (سندھ: شعبۂ اردو، جامعۂ سندھ، شمارہ ۱۰۔۱۱، مئی ۱۹۹۸ء) ص۶۷۰۔

۱۱۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "تحقیق و تصحیحِ متن کے مسائل"، مطبوعہ نقوش (ادارۂ فروغِ اردو، لاہور، شمارہ ۹۷، مارچ ۱۹۶۳ء) ص۱۰۔

۱۲۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: خسرو ثانی شیخ جمالی دہلوی، مطبوعہ اردو ادب (علی گڑھ، جلد ۴، نمبر ۱، جولائی تا ستمبر ۱۹۵۴ء) ص۱۵۰۔

۱۳۔ جمالی دہلوی: مثنوی مہر و ماہ (مقدمہ: حسام الدّین راشدی)، (راول پنڈی، انتشاراتِ مرکزِ تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۷۴ء) ص۱۰۳۔

۱۴۔ ظفر الہدیٰ، ڈاکٹر: جمالی، لودی اور مغل دور کا شاعر، مترجم: سلطان احمد، معارف (اعظم گڑھ، جلد ۱۲۳، عدد ۵، مئی ۱۹۷۹ء) ص ۳۶۵۔

۱۵۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: کیا مصباح الاوراح کا مصنف جمالی دہلوی تھا، مطبوعہ ماہنامہ معارف (علی گڑھ، جلد ۱۲۷، عدد ۴، اپریل ۱۹۸۱ء) ص ۲۷۰۔

۱۶۔ ڈاکٹر سید ضیاء الدین سجادی: مقدمہ ای بر مبانی عرفان و تصوّف، (تہران، سازمان مطالعہ و تدوین کتب علوم انسانی دانش گاہہا (سمت)، ۱۳۷۳) چاپ سوم، ص ۲۲۳۔

۱۷۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "دیوانِ حافظ میں الحاق"، مطبوعہ معارف (اعظم گڑھ، جلد ۷۹، نمبر ۱، جنوری ۱۹۵۷ء) ص ۴۳۔

۱۸۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "دیوانِ حافظ میں الحاق (۲)"، مطبوعہ معارف (اعظم گڑھ، جلد ۷۹، نمبر ۲، فروری ۱۹۵۷ء) ص ۱۱۱۔

۱۹۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "دیوانِ حافظ میں الحاق (۳)"، مطبوعہ معارف (اعظم گڑھ، جلد ۷۹، نمبر ۳، مارچ ۱۹۵۷ء) ص ۲۳۰۔

۲۰۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "دیوانِ حافظ کا ایک قدیم مخطوطہ"، مجلۂ علومِ اسلامیہ ادارۂ علومِ اسلامیہ (علی گڑھ، مسلم یونی ورسٹی، دسمبر ۱۹۶۰ء) ص ۶۸۔

۲۱۔ نذیر احمد، پروفیسر: "مقدّمۂ جامع دیوانِ حافظ کے بارے میں ایک مختصر گزارش"، مطبوعہ تحقیق، (جام شورو، سندھ: شعبۂ اردو، جامعۂ سندھ، شمارہ ۱۰۔۱۱، مئی ۱۹۹۸ء) ص ۲۱۸۔

۲۲۔ نذیر احمد، پروفیسر: "حافظ شیرازی کے دیوان میں غلط انتسابات کی مثالیں"، ایضاً، ص ۳۶۷۔

۲۳۔ صدیقی، محمد اکبر الدین: "مرزا محمد مقیم مقیمی سلمی مصنف چندر بدن و مہیار"، نوائے ادب (بمبئی، جلد ۸، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۵۷ء) ص ۵۶۔

۲۴۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "چندر بدن و مہیار کے مصنف کے تعین کے بارے میں محمد اکبر الدین صدیقی صاحب کی کوشش کا جائزہ"، (اردو ادب علی گڑھ، جلد ۶، نمبر ۳، دسمبر ۱۹۵۷ء) ص ۸۷۔

۲۵۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: " مونس الاحرار مؤلفہ احمد بن محمد کلاتی اصفہانی"، فکر و نظر (علی گڑھ، جلد ۵، نمبر ۳، شمارۂ مسلسل ۲۰، اکتوبر ۱۹۶۱ء) ص ۳۶۔

۲۶۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "تیرھویں صدی کا ایک اہم شاعر عمید تولکی سنامی"، فکر و نظر (علی گڑھ، جلد ۲، نمبر ۴، اکتوبر ۱۹۶۴ء) ص ۴۶۔

۲۷۔ نذیر احمد، پروفیسر: عمید لویکی کے کلام میں غلط انتسابات کی نشان دہی، مشمولہ تحقیق (جام شورو، شمارہ ۱۰۔۱۱، مئی ۱۹۹۸ء) ص ۳۸۶۔

۲۸۔ خواجہ بختیار کاکیؒ: دیوانِ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، (لکھنؤ، مطبع نامی منشی نول کشور، اشاعتِ دوم، ۱۸۸۲ء) ص ۲۲۶۔

۲۹۔ نذیر احمد، پروفیسر: کیا دیوانِ قطب الدین، دیونِ خواجہ بختیار کاکی ہے؟، مشمولہ معارف (اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۰ء) ص ۴۲۹۔

۳۰۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: "فارسی زبان وادب سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات (ایک جائزہ)"، مطبوعہ سہ ماہی اردو (کراچی، شمارہ ۴، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۰ء) ص ۴۲۔

۳۱۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: ''فرہنگِ قوّاس مؤلفہ فخر الدین مبارک شاہ غزنوی کا ایک جعلی نسخہ بھوپال میں''، غالب نامہ، (نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، جلد ۴، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۸۳ء) ص ۱۸۷۔

۳۲۔ زورؔ، ڈاکٹر سید محی الدین قادری (مرتب): کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ (حیدر آباد دکن، مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس، طبع اول، ۱۹۴۰ء) ص ۸۳۔

۳۳۔ ہارون خاں شروانی، پروفیسر: بھاگ متی کا افسانہ، (حیدرآباد دکن، مہتمم مطبوعات، سعود منزل، حمایت نگر، ۱۹۵۸ء) ص ۱۹۔

۳۴۔ نذیر احمد، ڈاکٹر: ''حیدرآباد کا پرانا نام: بھاگ نگر_افسانہ یا حقیقت'' (مشمولہ خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، شمارہ ۴۷، ۱۹۸۸ء) ص ۱۰۶۔